

فارسی ادب میں ایرانی اسلامی تہذیب کی پیش کش: نسیم بلوچ کی ترجمہ نگاری کا ایک مطالعہ
Representation of Iranian Islamic Civilization in Persian
Literature: A Study of Naseem Baloch's Translation Work

Dr. Zahid Akhter Shaheen

Visiting Assistant Professor Urdu, KFUEIT, Rahim Yar Khan

Dr. Shazia Andleeb

Assistant Professor of Urdu, KFUEIT, Rahim Yar Khan

Tehzeeb Sadiq

M Phil Scholar Urdu, Scholar, KFUEIT, Rahim Yar Khan

Abstract

The art of translation certainly had its origin in the day when people of two different nations needed to communicate to settle mutual relations and trade and only then did interpreters become indispensable. Basically, translation is the need of every nation and language in which the consciousness of the demand for knowledge has awakened. This is the reason why in every period of civilized life the seekers of knowledge went through the stage of translation to enjoy the treasures of knowledge and wisdom of other nations. The stages of translation were not only determined by the demanding knowledge, but those interested in the literature of other languages also benefited from the blessings of translation. Naseem Baloch is an emerging modern translator. His first fiction which he translated was



"Dash Akal" which was published in the literary edition of daily "Azad", Lahore in 1978.

Key Words: Iranian Islamic Civilization, Persian Literature, Naseem Baloch's Translation Work

تمہید

ترجمے کے فن کی ابتدا یقیناً اسی دن ہو گئی تھی جب دو مختلف قوموں کے افراد کو باہمی تعلقات اور تجارتی معاملات کو طے کرنے کے لئے رابطے کی ضرورت پڑی تھی اور تب ہی ترجمان بھی ناگزیر ہو گیا تھا۔ بنیادی طور پر ترجمہ ہر اس قوم و زبان کی ضرورت ہے جس میں علم کی طلب کا شعور بیدار ہو گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ متمدن زندگی کے ہر دور میں طلب گار علم دوسری قوموں کے علم و حکمت کے خزانوں سے خوشہ چینی کرنے کے لئے ترجمے کے مرحلے سے گزرتے رہے۔ تراجم کے مراحل صرف طلب گار علم نے ہی طے نہیں کئے دوسری زبانوں کے ادب سے دلچسپی رکھنے والوں نے بھی ترجمے کی برکات سے فیض حاصل کیا۔ درحقیقت ادبی تراجم کی کہانی تو تجسس کی کہانی ہے، ترجمہ نامعلوم جزیروں کا سفر اور ان کا مترجم ایک ایسا کھوجی مسافر جس کی دریافتیں اس کی زبان کے علی وادبی خزانے میں بیش قیمت اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ زندہ زبانیں اس سفر سے گھبراتی نہیں ہیں اس لئے ان کا ادب ہمیشہ تراجم سے زرخیز ہوتا رہتا ہے۔ تراجم کی ثقافتی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ایک دوسری مثال قدیم دانش وروں کی تصنیفی کاوش سے ملتی ہے۔ اگر سقراط، افلاطون اور مقراطیس کی ہزاروں سال پرانی تصانیف کا عربی زبان میں ترجمہ نہیں ہوتا تو یہ قیمتی سرمایہ کبھی کاروم اور یونان کے پرانے کھنڈروں میں دب دبا کر غارت ہو گیا ہوتا اور یورپ اور ایشیا کے ایوانوں میں آج ان کی گونج سنائی نہیں دیتی۔ اسی کے مثل بو علی سینا، ابو نصر فارابی، ابن رشد، الادریس کے کارنامے بغداد، غرناطہ اور یروشلم کے کتب خانوں میں ضائع ہو جاتے، اگر یورپی زبانوں نے انہیں اپنے قالب میں ڈھال کر چراغ سے چراغ جلانے کا سلسلہ جاری نہ رکھا ہوتا۔

نسیم بلوچ اور ان کی ترجمہ نگاری

نسیم بلوچ کی تدریس کا مضمون فارسی ہے جب کہ اردو ادب میں ایم اے کرنے کے علاوہ اردو زبان کے ادیب بھی ہیں۔ ان کی اس ضمن میں بہت سی جہتیں ہیں۔ گویا وہ بحیثیت ترجمہ نگار دونوں زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ زمانہ طالب علمی 1976ء میں وہ مختلف روزناموں کے لئے انگریزی کے مضامین بھی ترجمہ کرتے رہے ہیں۔ فارسی افسانوں کا اردو ترجمہ بھی زمانہ طالب علمی کے دوران شروع کیا۔ وہ ترجمہ نگاری کا ایک طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں عارف عزیز بھوپال لکھتے ہیں:

گورنمنٹ کالج ساہیوال جہاں سے نسیم بلوچ نے انٹراوربی۔ اے کیا، وہاں پڑا سلیشن یا ترجمہ سوسائٹی تھی جس کے انچارج ”وار اینڈ پیس“ کا جنگ اور امن کے نام سے ترجمہ کرنے والے معروف ترجمہ نگار اور انگلش کے پروفیسر شاہد حمید تھے۔ ان کی تحریک پر انھوں نے کالج میگزین ”ساہیوال“ کے کے ایک

شمارے کے پیش لفظ کا اردو ترجمہ کیا۔ انگریزی کے ایک اور پروفیسر بشیر احمد گل کی نگرانی میں ایک اور انگریزی مضمون کا ترجمہ کیا۔ اسی تجربے کو کام میں لاتے ہوئے، ایم اے کرنے کے بعد لاہور کے چند روزناموں کے لیے محدود پیمانے پر بین الاقوامی انگریزی مضامین کے اردو تراجم کئے مگر باقاعدہ طور پر

ترجمہ نگاری کا کام ایرانی افسانوں کے تراجم سے شروع ہوا۔¹

ذیل میں مختلف نکات کو سامنے رکھتے ہوئے نسیم بلوچ کے تراجم کا جائزہ لیتے ہیں:

محمد علی جمائزادہ اور صادق ہدایت

ایرانی افسانہ نگاروں میں محمد علی جمائزادہ سب سے پہلے یعنی بانی افسانہ نگار ہیں۔ دوسرے نمبر پر صادق ہدایت آتے ہیں جو فارسی افسانے کا بہت بڑا نام ہیں۔ ان کے افسانے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے غیر معمولی انفرادیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپریل 1951ء میں پیرس کے ایک ہوٹل میں گیس سے کمرہ بھر کر خودکشی کر لی۔ صادق ہدایت ایک تخلیقی ذہن کا مالک ہے جو اپنی کہانی کا پلاٹ باریک بینی اور مہارت سے بنتا ہے۔ اس کے افسانوں کا اختتام ایک بھرپور تاثر کا حامل ہوتا ہے۔ اسے اپنے کرداروں کی اندرونی کشمکش اور اضطراب اور باطنی کیفیات کی تصویر کشی پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے اکثر افسانوں کے کردار آخر میں مر جاتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔

نسیم بلوچ کا پہلا ترجمہ: "داش آکل"

نسیم بلوچ کا پہلا افسانہ جس کا انھوں نے ترجمہ کیا وہ "داش آکل" ہے۔ جو روزنامہ "آزاد"، لاہور کے ادبی ایڈیشن میں 1978ء میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ صادق ہدایت کے افسانوی مجموعے "سہ قطرہ خون" سے لیا گیا ہے۔ داش غنڈے کو کہتے ہیں۔ آکل در اصل ایک پہلوان نما غنڈہ ہے اور اس کے علاقے میں اسی کی چلتی ہے۔ دیگر بد معاشوں سے اس کی چپقلش چلتی رہتی ہے۔ محلے کا ایک آدمی حاجی صمد مرتے وقت اپنی جوان بیٹی مرجان اور اپنے بچوں بشمول بڑے بیٹے ولی خان کو داش آکل کی سرپرستی میں دے دیتا ہے، گویا اسے اپنے خاندان کا وصی مقرر کر دیتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر بد معاشی چھوڑ دیتا ہے۔ اسے حاجی صمد کی واحد بیٹی مرجان سے محبت ہو جاتی ہے مگر اخلاقی ذمہ داری کی وجہ سے اس سے اظہار نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس ایک طوطا ہے جس کے سامنے وہ مرجان سے اپنی محبت کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ بد معاشی چھوڑنے کی وجہ سے وہ کمزور پڑ جاتا ہے جس سے دیگر بد معاش اس پر چڑھ دوڑتے ہیں مگر وہ صبر سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنا فرض سمجھ کر مرجان کی شادی شان و شوکت سے کر دیتا ہے۔ شادی کے فوراً بعد علاقے کے حریف بد معاش کے ہاتھوں وہ شدید زخمی ہو کر قریب المرگ ہوتا ہے۔ وہ ولی خان کو بلا بھیجتا ہے اور اس کے ہاتھوں اپنا طوطا مرجان کے لئے بھیج دیتا ہے۔ اس افسانے کے اردو ترجمہ کے اختتامی پیرے کا فارسی اقتباس اور اس کا اردو ترجمہ بطور نمونہ مندرجہ ذیل ہے۔

"فردا صبح ہمیں کہ خبر زخم خوردن داش آکل بہ خانہ حاجی صمد رسید ولی خاں پسر بزرگش بہ احوال پرسی او رفت۔، سر بالین داش آکل کہ رسید، دید او بارنگ پریدہ در رختخواب افتادہ کف خونین از دھنش

بیرون آمدہ و چشمہائیش تار شدہ بود، بدشواری نفس میکشید، داش آکل مثل اینکہ درحالت انما اورا شناخت، باصدای نیم گرفته ولرزان گفت۔ اگلی صبح داش آکل کے شدید زخمی ہونے کی خبر حاجی صمد خاں کے گھر پہنچی تو اس کا بڑا بیٹا ولی خان اس کا حال پوچھنے آیا۔ وہ اس کے سرہانے کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بستر پر پڑے ہوئے داش آکل کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ اس کے منہ سے خون جھاگ کی صورت رواں تھا۔ اس کی آنکھیں دھندلا چکی تھیں اور وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ داش آکل نے نیم بیہوشی میں بھی اسے پہچان لیا۔ وہ لڑکھڑاتی اور ٹوٹتی ہوئی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔²

”آبجی خانم“

صادق ہدایت کا دوسرا افسانہ ”آبجی خانم“ کا ترجمہ اس کے اصلی عنوان سے ہی کیا گیا ہے۔ جو ”الزبیر“ بہاولپور کے شمارہ نمبر 3 میں 1998ء میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ صادق ہدایت کے افسانوں کے مجموعے ”زندہ بگور“ سے لیا گیا ہے۔ یہ کہانی دو بہنوں کی ہے جو شکو صورت اور عادات و اطوار کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بڑی بہن آبجی خانم کے مقابلے میں اس کی چھوٹی بہن کو خوبصورتی اور اچھی عادات کے باعث سب اہمیت دیتے ہیں اور پسند کرتے ہیں جب کہ آبجی خانم کو نظر انداز کیا جاتا ہے جس سے اس کے اندر احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مذہبی سرگرمیوں میں خود کو مصروف کر لیتی ہے اور اپنی پارسائی کے زعم میں چھوٹی بہن کو تنگ کرتی رہتی ہے۔ وہ ہر مجلس میں پہلی صف میں موجود ہوتی ہے اور والدین اور محلے داروں سے شکوہ کناں اور رنجیدہ رہتی ہے کہ میرے جیسی نیک اور پرہیزگار کے مقابلے میں چھوٹی دنیا دار بہن ماہرخ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ بہترین کردار نگاری اور واقعاتی ترتیب سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ آبجی خانم اپنی چھوٹی بہن سے جلتی بھنتی رہتی ہے اور مذہبی فرائض کے حوالے سے اسے تنگ کرتی رہتی ہے کہ وہ دوزخ میں جائے گی جب کہ میں سیدھی جنت میں جاؤں گی۔ وہ خود کو نیک اور جنتی سمجھتی ہے۔ ماہرخ کی شادی طے ہو جاتی ہے۔ آبجی خانم حسد کے مارے خلفشار کا شکار ہو جاتی ہے اور شادی کی کسی تقریب میں حصہ نہیں لیتی بلکہ سیاہ چادر اوڑھے اپنے کمرے میں بند ہو جاتی ہے۔ اس کی ماں اسے طعنے دیتی ہے کہ وہ اپنی بہن کی شادی میں حسد کے مارے حصہ نہیں لے رہی۔ بالآخر شادی کی رسوم مکمل ہو جاتی ہیں۔ اس دن اس کی محرومی کا احساس اپنی انتہائی حد کو پہنچ جاتا ہے۔ اس افسانے کے آخری پیرے کا فارسی اقتباس اور اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

”نصف شب بود، ہمہ بیاد شب عروسی خودشان خواہیدہ بودند و خواب های خوش می دیدند۔ ناگہان مثل اینکہ کسی در آب دست و پامزد، صدای شلپ شلپ ہمہ اہل خانہ را سرا سیمہ از خواب بیدار کرد۔ اول بخیا نشان گر بہ یا بچہ در حوض افتادہ، سر و پا برہنہ چراغ را روشن کردند، ہر جا را گشتند چیزی فوق العادہ ای رخ ندادہ بود و قتی کہ برگشتند بروند بخوابند، نہ حسن دید کفش دم پائی آبجی خانم نزدیک دریچہ آب انبار افتادہ، چراغ را جلو بردند دیدند نعش آبجی خانم آمدہ بود روی آب، موہای بافتہ سیاہ او مانند مار بدور گردش پیچیدہ بود، رخت زنگاری او بہ تنش چسپیدہ بود، صورت او یک حالت با شکوہ و نورانی داشت مانند این بود کہ اورفتہ بود بیک جائی کہ نہ زشتی و نہ خشنگلی، نہ عروسی و نہ عزاء، نہ خندہ و نہ گریہ، نہ شادی و نہ اندوہ در آنجا وجود نہ داشت۔ اورفتہ بود بہ بہشت!!“

اردو ترجمہ: آدھی رات کے وقت جب نکاح کے ہنگاموں سے فارغ ہو کر گھر کے تمام افراد خوب گہری اور میٹھی نیند سو رہے تھے کہ اچانک پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے سے شلپ شلپ کی آواز سے تمام افراد جاگ گئے۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ شاید بلی یا اس کا بچہ گھر سے ملحقہ بڑے تالاب میں گر گیا ہے تاہم انھوں نے ننگے سر اور بغیر جوتے پہنے چراغ جلا یا اور اس طرف بھاگے۔ انھوں نے چراغ کی روشنی میں ہر طرف دیکھا مگر کوئی غیر معمولی چیز نظر نہ آئی۔ جب وہ دوبارہ سونے کی نیت سے واپس جانے لگے تو خالہ حسن کو چراغ کی روشنی میں آجکی خانم کے پاؤں کی جوتی تیرتی نظر آئی۔ تمام لوگ چونکے اور اس طرف بڑھے۔ اتنے میں آجکی خانم کا جسم پانی کی سطح پر ابھر آیا تھا۔ اس کے گندھے ہوئے سیاہ بال سانپ کی طرح اس کی گردن کے گرد لپٹے ہوئے تھے۔ سبزی مائل لباس اس کے جسم کے ساتھ چپک گیا تھا۔ دنیا بھر کی چمک، نور اور طمینان اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ وہاں چلی گئی تھی جہاں خوبصورتی و بد صورتی، جشن و سوگ، ہنسی و نالہ اور خوشی و غم قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔۔۔۔۔ شاید وہ بہشت میں پہنچ گئی تھی۔“³

”داؤد کوڑپشت“

صادق ہدایت کا تیسرا افسانہ ”داؤد کوڑپشت“ بھی اس کے مجموعے ”زندہ بگور“ میں شامل ہے۔ اس کا ترجمہ ”کبڑا داؤد“ کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ (غیر مطبوعہ، ”فارسی افسانہ اردو میں“، زیر ترتیب میں شامل) یہ ایک ایسے معذور اور کبڑے شخص کی کہانی ہے جو بیک فلیش میں لکھی گئی ہے اور اس میں باطنی کیفیات کا اظہار اس کو بہت پر اثر بنا دیتا ہے۔ اس میں مرکزی کردار تمام افسانے میں اپنی لاشی کے ساتھ پیدل چل رہا ہے اور خود کلامی سے اس افسانہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی ظاہری صورت ہیئت کدائی کی تصویر نظر آتی ہے مگر اس کے اندر بھی جذبات اور احساسات کا ایک دریا موجزن ہے۔ اسے اپنے سکول کا زمانہ یاد آتا ہے جب اس کا دل بھی کھیلنے کو کرتا تھا مگر ساقی بچے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ یاد کرتا ہے کہ اس کے تمام بھائی بہن بھی معذور تھے مگر وہی ایک زندہ بچ گیا تھا۔ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی بہنوں کو خوش قسمت قرار دیتا تھا، اس نے دو عورتوں کو رشتہ بھی بھیجا مگر انھوں نے یہ کہہ کر ٹھکرادیا کہ ہمارے لئے کیا یہی کبڑا ہی رہ گیا ہے۔ ان میں ایک زینبہ تھی جس کی تھوڑی پر تل تھا۔ اسی داخلی کشمکش کے دوران جب اندھیرا چھا گیا تو اس نے ایک بیمار اور لاغر کتا دیکھا۔ یہ پیرا بہت اہم ہے جس کا فارسی اقتباس درج ذیل ہے۔

”از کنار جوی آہستہ میگذشت و گاہی با تہہ عصایش روی آب رامی شکافت، افکار او شوریدہ و پریشان بود۔ دید سگ سفیدی با موہای بلند از صدای عصای او کہ بسنگ خورد سرش را بلند کردہ او نگاہ کرد مثل چیزیکہ ناخوش یا در شرف مرگ بود۔ نتوانست کہ از جایش، تکان بخورد و دوبارہ سرش افتاد بہ زمین۔ او بزحمت خم شد در روشنائی مہتاب نگاہ آنہا بہم تلاقی کرد۔ یک فکرہای غریبی برایش پیدا شد، حس کرد کہ این نخستین نگاہ سادہ و راست بود کہ او دیدہ، کہ ہر دو آنہا بد بخت و مانند یک چیز نخالہ، وازدہ و بچنود از جامعہ آدم ہماراندہ شدہ بودند۔ میخواست پہلوی این سگ کہ بد بختیہای خودش را بہ بیرون شہر کشانیدہ و از چشم مردم پنهان کردہ بود۔ بنشیند و اوراد را آغوش بکشد۔ سراوہ سینہ پیش آمدہ خودش بفشارد۔ اما این فکر برایش آمد کہ اگر کسی از اینجا بگذرد و ببیند

بیشتر اور ایشیائی تہذیبوں کو اہندہ کرد۔ اردو ترجمہ: وہ ندی کے کنارے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا اور کبھی کبھار اپنی لالٹھی پانی کی سطح پر مارتا جاتا جس سے پانی کی سطح میں ایک عارضی لکیر سی پڑ جاتی۔ اس کے خیالات بہت منتشر اور مضطرب تھے۔ اسی دوران اسے لمبے بالوں والا ایک سفید رنگ کا کتا نظر آیا جس نے اس کی لالٹھی کے پتھر سے ٹکرا کر پیدا ہونے والی آواز سن کر سر اٹھایا۔ کتے نے اسے دیکھا جیسے وہ بیمار یا قریب المرگ ہو۔ کتا اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا لہذا اس نے دوبارہ اپنا سر زمین پر رکھ دیا۔ وہ بمشکل نیچے جھکا۔ چاند کی روشنی میں دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کے اندر ایک عجیب احساس پیدا ہوا، اسے محسوس ہوا کہ یہ پہلی اور پر خلوص نگاہ تھی جس نے اسے دیکھا تھا کیونکہ دونوں بد بخت، فالتو اور کچرے کی مانند تھے جو انسانوں کے معاشرے کے دھنکارے ہوئے تھے۔ اس نے چاہا کہ اس کتے کے پاس بیٹھے کہ جو اپنی بدنصیبیوں کو چھپا کر شہر سے دور لے آیا تھا اور چاہا کہ اسے گلے سے لگا لے اور اسے اپنے ابھرے ہوئے سینے میں بھینچ لے لیکن اس کے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ کوئی گزرتا ہوا شخص اسے دیکھ لے گا تو اس کا بہت زیادہ ٹھٹھہ اڑائے گا۔⁴ اس کے بعد اسے ایک عورت ندی کے کنارے کھڑی نظر آئی۔ وہ اس کے قریب جاتا ہے کہ بات کر سکے مگر عورت اپنے خیالوں میں گم جب کسی کو قریب پاتی ہے تو کہتی ہے ارے ہوشنگ تم آگئے ہو، یہ کہتا ہے کہ میں ہوشنگ نہیں، داؤد ہوں۔ اس عورت کو جب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کبڑا داؤد ہے تو اس کی طرف دیکھے بغیر نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے تمہیں دیکھنے سے میری آنکھیں درد کرنے لگتی ہیں۔ داؤد نے دیکھا کہ اس کی ٹھوڑی پر تل ہے وہ پہچان جاتا ہے کہ یہ تو وہی زینبہ ہے۔ وہ اس کی طرف سے نفرت کے ساتھ دھنکارے جانے کے بعد بہت مایوس ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد افسانے کا آخری پیرا بھی کمال کا ہے۔

میر محمد حجازی اور فارسی افسانہ نگاری

فارسی افسانہ نگاری میں تیسرا اہم نام میر محمد حجازی کا ہے جو فارسی کے بہت بڑے ناول نگار بھی ہیں۔ انھوں نے ایرانی معاشرے میں بالائی معاشرتی طبقے کی سماجی اقدار اور منافقتوں کا پردہ چاک کیا۔ اس کے علاوہ ایرانی معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو اپنے خاص اسلوب سے اجاگر کرنا ان کے افسانوں کا اہم موضوع ہے۔ علامتی افسانے میں بھی ان کو کمال حاصل ہے۔ ان کے افسانے ”خود کشی“ کا اردو ترجمہ اسی عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ جو ”الزبیر“ بہاول پور کے شمارہ نمبر 2 میں 1996ء میں شائع ہوا۔ خود کشی دراصل ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جو دنیا کو اپنے انداز سے دیکھتا ہے۔ مرکزی کردار اپنے ایک دوست کے پاس آتا ہے اور زمانے سے جو اسے شکایات ہیں وہ اس کے اپنے ذہن اور احساس کی پیداوار ہیں اور ان کے رد عمل میں وہ خود کشی کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے دوست سے خود کشی کرنے کا مناسب طریقہ پوچھنے آتا ہے۔ دوست پہلے تو اس سے مذاق کرتا ہے کہ چونکہ اس کو ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے اس لئے اس کی بہتر رہنمائی نہیں کر سکتا۔ جنھوں نے خود کشی کی وہ بھی واپس نہیں آئے تا کہ ان سے ہی پوچھ لیا جاتا۔ ایک دوست نے پستول سے خود کشی کی کوشش کی مگر اس کا ہاتھ لرز گیا اور گولی اس کے کانوں کے آر پار ہو گئی۔ وہ بچ تو گیا مگر سماعت سے محروم ہو گیا اور اس نے مزید ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ پھر وہ دوست سے خود کشی کی وجوہات پوچھتا ہے جس کی تفصیل سننے کے بعد وہ اس کو صرف دو دن کے لیے ایک پروگرام کے تحت زندگی گزارنے کی نصیحت

کرتا ہے۔ وہ دودن اس کی زندگی کو تبدیل کر دیتے ہیں اور اسے زندہ رہنے کی ترغیب ملتی ہے۔ اسے زندگی اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ خود کشی کرنے کی جو وجوہات بتاتا ہے وہ اصل افسانے میں مندرجہ ذیل ہیں۔

”چرا خچالم رادائم مشوش و پریشان میکنند، چرا زندگی را بمن سخت گرفتند! البتہ منضم دردم حس کینہ و انتقام میکنم و از این حس رنج میبرم۔ آیامزاحمت غیر از این است؟ و اما دوستان و رفقا، بمحض آنکہ تمنای یک نفس بایک قدم همراہی کردی لبشان از تبسم جمع می شود و رو میگردانند، انسان در دنیا تنہا و غریب است، باز کاشکی تنہا بودیک عدہ ہم مثل زبور بجانش می افتند، شیرینی می برند و نیش میزنند! آیامزاحمت غیر از این است؟ نمی دانم لذت این دنیا چیست، باچہ میشود خوش بود! مثل گاو عصارى ہر روز از صبح تا غروب میرویم و بجائی نمیرسیم! گرچہ اگر وسایل داشتیم میدانستیم چطور باید لذت برد! افسوس کہ نشاط این دنیا را باید پول خرید۔ منضم کہ دستم خالی است۔ چہ میتوان کرد، قسمت مادر این دنیا این بود۔“ اردو ترجمہ: ان کے اس رویے سے میرا ذہن ہر وقت منتشر اور مشوش رہتا ہے۔ انہوں نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ میرا دل انتقامی جذبے سے بھرا رہتا ہے جس سے میں اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہوں اور یہ کیفیت مجھے زیادہ اذیت دیتی ہے۔ جہاں تک دوستوں کا تعلق ہے تو اگر میں کسی دوست سے ملوں، اس کے ساتھ زیادہ وقت گزاروں تو دوسرے دوست حسد کرتے ہیں۔ میرے دوست شہد کی مکھیوں کی طرح ہیں جو شہد بھی دیتی ہیں اور ڈنک بھی مارتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم کو بلو کے نیل کی طرح صبح سے شام تک کام میں جتے رہتے ہیں مگر کسی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ ہاں اگر میرے پاس بھی وسائل ہوتے تو میں جانتا کہ زندگی سے کیسے لطف اندوز ہوا جاتا ہے مگر افسوس کہ اس دنیا کی خوشیاں خریدنے کے لئے دولت بہت ضروری ہے اور ایک میں ہوں خالی ہاتھ۔ کیا کیا جاسکتا ہے، میرا مقدر ہی کچھ ایسا ہے۔“⁵

”عیدی“

میر محمد جازی کا دوسرا افسانہ ”عیدی“ ایک علامتی افسانہ ہے اور بہت معنویت کا حامل ہے جو ”الزبیر“ بہاول پور کے شمارہ نمبر 4 میں 1996ء میں شائع ہوا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ”میری بیوی ہر عید پر مجھے عیدی دیتی ہے۔ اس دفعہ کی عید کی عیدی یہ تھی کہ میری مطالعہ گاہ کا تمام فرنیچر تبدیل کر دیا جائے گا۔ میں بہت خوش ہوا مگر رات کو جب میں اکیلا تھا تو کمرے کا سارا فرنیچر زار و قطار رو کر مجھ سے گویا ہوا۔ دیکھو ہم تمہارے دیرینہ ساتھی ہیں۔ ہم نے تمہاری تنہائی بانٹی ہے۔ تمہارے دکھوں میں تمہارے شریک رہے ہیں، پرانے دوستوں کو چھوڑ دینا کہاں کی اچھائی ہے۔ ہم تمہاری ہر کیفیت اور دل کا حال جانتے ہیں۔ نئے دوست پرانے دوستوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ سب سے زیادہ تو میری مطالعہ کی کرسی دکھی تھی۔ کہنے لگی، میں تمہاری پرانے وقتوں کی غمگسار اور ساتھی ہوں۔ میں تمہاری پہلی محبت کی واحد گواہ ہوں۔ تمہارے ہر دکھ سکھ میں حصہ دار رہی ہوں۔ اس افسانے میں یہی پرانی کرسی ہی سب سے زیادہ اور طاقتور علامت ہے۔

”نالہ ہای پنهان دل را کہ نمیتوان دلیل رد احسان آورد۔ آمدند و یک بیک اسباب اتاق را بردند تا نوبت صندلی رسید کہ از همه کہنہ تر و خرابتر بود۔ گوئی خوشترین غزل را از دیوانی بردارند یا از دفتر خاطر اتی، شیرین ترین قصہ را بکشند! صندلی را برد و دست نگاہداشتم و در دل فریاد کردم کہ ای امان، این صندلی، شاہ غزل دیوان عشق و دلکش ترین خاطرہ زندگی من است! این کی را برای من بگذارید و باقی را برید۔“

اردو ترجمہ: بہر حال دل کی پوشیدہ فریادیں احسان لوٹانے کی دلیل نہیں بن سکتیں۔ آخر ایک دن لوگ آئے اور سامان کو باری باری باہر لے جانے لگے حتی کہ اس کرسی کی باری آگئی جو زیادہ پرانی اور بوسیدہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دیوان سے ایک خوبصورت غزل کو نکالا جا رہا ہو یا میری ڈائری سے کسی دلچسپ ورق کو مٹایا جا رہا ہو۔ میں نے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور دل ہی دل میں فریاد کی یہ کرسی عشق کے دیوان کی شاہ غزل اور میری زندگی کا دلکش ترین تصور ہے۔ اسے میری خاطر رہنے دو اور باقی سامان لے جاؤ۔“

افسانے کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ وزارت خانے کا ایک افسر گھٹنوں کے درد کی وجہ سے علیل اور صاحب فراش ہے اور اس کی بیمار پرسی کی ایک محفل سچی ہوئی ہے جس میں بیشتر افسران موجود ہیں اور ہر کوئی بیمار پرسی میں چاہلوسی کے باعث مبالغے کی حد تک آگے نکلنے کی کوشش میں ہے۔ کہانی کا متکلم کردار تاخیر سے پہنچا اور اسے ایک کونے میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ اس نے کچھ جملے سوچ رکھے ہیں جنہیں وہ جب بھی ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے باری نہیں ملتی یا اس سے کوئی بات اچک لیتا ہے لہذا وہ تھک ہار کر چپ رہتا ہے اور وہاں کی گفتگو سننے لگ جاتا ہے۔ اس کے بعد پہلے سے موجود ہر شخص ایک دوسرے سے خوشامد میں آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈاکٹر لطف علی صورنگر

ڈاکٹر لطف علی صورنگر معروف ایرانی شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ نقد ادب میں بھی ان کا جدید ایرانی ادب میں منفرد مقام ہے۔ دریائے گوہر کی پہلی جلد مرتبہ مہدی حمیدی میں معاصر افسانوں کا انتخاب دیا گیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر لطف علی صورت گر کے دو افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے ایک دلچسپ افسانہ ”از دفتر خاطر ات یک الاغ“ کا اردو میں ”گدھے کی ڈائری سے ایک ورق“ کے عنوان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس دلچسپ افسانے میں گدھے کے بچے اور اس کی عملی زندگی میں قدم رکھنے کی کہانی ہے جس میں گدھے کی ایک معاشرتی سمجھ بوجھ رکھنے والے فرد کے طور پر تجسیم کی گئی ہے۔ اس کا آغاز گدھے کی طرف سے ایک طنزیہ گفتگو سے ہوتا ہے جس میں گدھا کہتا ہے کہ میرے مالک سے کوئی پوچھنے والا ہے کہ وہ کس دلیل سے حماقت کو میرے ساتھ منسوب کرتا ہے۔ اس کے بعد اس ”نوجوان“ گدھے کو ایک ایسا شخص خرید لیتا ہے جس نے پاکبازی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ گدھا اس کی ریاکاری اور منافقت کا پردہ چاک کر کے اس کا اصل چہرہ عوام کو دکھانے کا فیصلہ کرتا ہے جس میں وہ کامیاب رہتا ہے اور لوگوں سے داد وصول کرتا ہے۔ اس کہانی سے چند اقتباسات اور ان کا ترجمہ بطور نمونہ ذیل میں دیا گیا ہے۔

”یک نفر نیست کہ از مہتر من پیر سد بچہ دلیل تصور میکند، مابی اطلاع و شعور خلق شدہ ایم و بکدام حق ہر وقت بیک نفر انسان میخوانند نسبت بحق بدہند اور ابما تشبہہ میکنند۔ شتا تصور میکنید در زیر قبہ نیلگون سپہر علم و اطلاع خاص شتا جماعت بشر است چون از بعضی اسرار وجود پی بردہ و دستہ ای از حیوانات را بطاعت خویش آوردہ اید تمام معضلات حیات برای شتا حل شدہ و ہیچ رازی نگشادہ بر جای نیست و از ہمین راہ غرور و تکبر شمار از راہ بدر بردہ است۔ اردو ترجمہ: ایسا کوئی بھی نہیں کہ جو میرے مالک سے پوچھے کہ وہ کس دلیل کے باعث ہمیں جاہل اور بے شعور سمجھتا ہے۔ اور انسان کو یہ حق کس نے دیا ہے وہ جب چاہتا ہے حماقت اور بیوقوفی کو ہم سے منسوب کر دیتا ہے۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ آسمان کی اس نیلی چھت کے نیچے صرف انسان ہی علم و شعور کا حامل ہے۔ اگر زندگی کے چند اسرار جان لینے یا چند جانوروں کو سدھا لینے سے انسان یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اس نے تمام مسائل کا حل ڈھونڈ لیا ہے اور کوئی عقدہ لائیکل نہیں رہا تو دراصل اسی تکبر اور غرور نے اسے سیدھے راستے بھٹکا دیا ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔“⁷

شہین پر تو فارسی ادبی تاریخ کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ تحقیق و تنقید، ادبی تاریخ، اور افسانوں کے لئے معروف ہیں۔ ان کا ایک افسانہ ”از این دریا از آن در“ ان کا معروف افسانہ ہے جس کا اردو ترجمہ ”وفا“ کے نام سے کیا گیا ہے جو ”الزیر“ بہاول پور کے شمارہ نمبر 1 میں 1996ء میں سامنے آیا۔ جس میں جو اکیلے والوں کی نفسیات کا بڑی مہارت سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس میں صرف تین کردار ہیں۔ حشمت دیوان اور سلیمان خان دونوں متمول خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور آپس میں گہرے دوست ہیں۔ جو ا اور شکار ان کا مشترکہ پسندیدہ مشغلہ ہے۔ حشمت دیوان کے گھر دونوں جوئے کی بازی میں مصروف ہیں۔ سلیمان بازی پر بازی جیت رہا ہے اور وہ اپنے دوست کو مزید کھیلنے سے منع کرتا ہے مگر وہ کھیلنے سے باز نہیں آتا۔ وہ تمام گھر اور جائیداد حتیٰ کی اپنی پیاری بیوی ”آہو“ بھی ہار جاتا ہے۔ آخر میں سلیمان خان ایک شرط رکھتا ہے۔ افسانے کے آخری اور اختتامی پیرے میں اس کا ذکر ہے جسے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

” (فارسی اقتباس) سلیمان گفت: ----- می دانی سر تو کہ بازی کردیم، یک شرط ہم کردہ ام و آن این است کہ اگر تو راضی بشوی از حشمت دیوان دست بکشی زن من خواہی شد! واگر میل نداشتہ باشی من از حق خودم صرف نظر خواہم کرد“ آہو گریہ می کرد۔ چیزی نمی گفت۔ سلیمان خان بہ اونزدیک شدہ گفت: ----- چرا اینجو دگریہ میکنی؟ اگر قلبت بمن میل داشتہ باشد من حاضر م، ترا خوش بخت کنم و تمام عمر ترا دوست بدارم۔ اگر ہم مرانی خواہی من حرفی ندارم۔

اردو ترجمہ: سلیمان نے کہا ”تمہیں شاید معلوم نہیں کہ جب اس نے تمہیں داؤ پر لگایا تھا تو میں نے بھی یہ شرط رکھی تھی کہ تم حشمت دیوان کو چھوڑنے اور میرے ساتھ جانے میں خوش ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں

آغوش میں بھینچ لیا اور (پی یر) کہتی ہوئی میرے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ بندہ کا تعلق کا شان سے ہے اور کاشانی اپنے بچوں کا نام (پی یر) نہیں رکھتے۔ آپ ہی بتائیں اس اچانک افتاد پر میں کیا کرتا کہ جو موزوں ہوتا۔“⁹

"داشتم فریان می زدم"

1979ء کے اسلامی انقلاب کے بعد ایرانی معاشرہ غیر معمولی تبدیلیوں سے دوچار ہوا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایران کا سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ ایرانی تاریخ میں سو لہویں صدی کے آغاز پر بھی ایسی ہی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں جب شاہ اسماعیل صفوی نے ایک ہی مذہبی مسلک کو سرکاری قرار دے کر صفوی خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔ اس وقت بھی ایران میں قصیدہ و غزل کی قدیم روایت کی بجائے مرثیے کی حوصلہ افزائی کی گئی اور شعرانے ہندوستان میں مغل دربار کا رخ کیا۔ اس بار تمام ترقی پسند لکھاری اور فنکاروں نے ایران کی بجائے دیگر ممالک کی طرف ہجرت کو ترجیح دی۔ فارسی افسانے کے حوالے سے پہلے اور اسلامی انقلاب کے درمیان ایک خط کھینچا جاسکتا ہے۔ موضوع اور اسلوب کے لحاظ 1979ء کے بعد کا افسانہ مکمل طور پر مختلف ہے۔ ایران میں سینسر کی وجہ سے اشاعت سے پہلے اجازت نامہ جاری کروانا پڑتا ہے۔ جمال میر صادقی کا تعلق افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے جو 1960ء کی دہائی کے دوران سامنے آئی۔ انقلاب کے بعد ان کی کئی کہانیاں اور ناول سینسر کی زد میں آئے۔ 1987ء (ایرانی سال 1366) کے دوران انھوں نے "داستان ہای نو" یعنی نئی کہانیاں کے عنوان سے مختلف افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا ایک طویل مقدمے کے ساتھ ایک انتخاب شائع کیا۔ اس کے آخر میں ان کی دو کہانیاں بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک کہانی کا اردو ترجمے کے لئے انتخاب کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے "داشتم فریان می زدم" لفظی ترجمہ "میں نعرے لگاتا چلا گیا" ہے مگر اردو ترجمہ کا عنوان "کاپلاٹ" رکھا گیا ہے۔ ان کے اسلوب کی بنیادی بات یہ ہے "کہ جیسا بولویا لکھو"۔ یہ افسانہ "الزبیر" بہاول پور کے شمارہ نمبر 2 میں 2000ء میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ انقلاب کے تھوڑے عرصے بعد 1979ء کے آخر میں لکھا گیا تھا۔ اس افسانے میں ایک نوجوان سرکاری ملازم ہے اور کمر کے درد کی وجہ سے تعطیلات پر تھا اور ان کے ختم ہونے کے بعد وہ پیدل دفتر کی جانب جا رہا تھا۔ چونکہ وہ تین ہفتوں کے بعد باہر نکلا تھا مگر ماحول بہت کشیدہ اور احتجاجی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا گیا اس کے ساتھ مختلف واقعات پیش آتے گئے جن کی وجہ سے اس کے اندر انقلابی تحریک سے ہمدردی پیدا ہو گئی اور وہ جب ایک بڑے احتجاجی جلوس کا حصہ بنا تو اس میں مکمل تبدیلی رونما ہو چکی تھی اور وہ بھی چیختے ہوئے انقلاب کے حق میں نعرے لگا رہا تھا اس لئے اس کا عنوان "کاپلاٹ" رکھا گیا ہے۔ "از خانہ کہ در آمد، آفتاب تو کوچہ پہن شدہ بود، از بقال سر کوچہ سیدگار خریدم۔ خوش خشک راہ افتادم۔ دلم می خواست گشتی بزنم و هوایی بخورم، یکی دو هفته ای از خانہ بیرون نیامده بودم۔ هوای آفتابی خوبی بود، راہ رفتن کیف می داد، ہمہ چیز بہ نظرم تازہ می آمد۔ کوچہ ہا پر شدہ بود از شعار۔ کار بروچہ ہای محلہ بود۔ شب ہا با چراغ قوہ راہ می افتادند و با گچ و زغال رو دیوار ہا شعاری نوشتند۔ می گفتند دانشکدہ ہا تعطیل شدہ، مدرسہ ہا بستہ اند و خیابان ہا پر شدہ از سرباز۔ اردو ترجمہ: جب میں گھر سے باہر نکلا تو گلی میں دھوپ پھیل چکی تھی۔

میں نے گلی کی ٹکڑ پر واقع دکان سے سگریٹ خریدے اور خوش خوش چل دیا۔ میرا دل ہواخوری اور سیر کرنے کو چاہ رہا تھا۔ دراصل میں دو تین ہفتوں سے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ دھوپ خاصی خوشگوار تھی اور مجھے پیدل چلنے میں خاصا لطف آ رہا تھا۔ آج مجھے باہر کی ہر چیز نئی لگ رہی تھی۔ گلیاں اور کوچے نعروں سے بھرے پڑے تھے اور یہ کام محلے کے بچوں اور جوانوں کا تھا۔ راتوں کو وہ فلیش لائٹس لئے چلتے جاتے اور دیواروں پر چاک اور کونلوں سے نعروں لکھتے جاتے۔ کہتے تھے تعلیمی ادارے بند ہیں اور سڑکیں سپاہیوں سے بھری پڑی تھیں۔¹⁰

خلاصہ بحث

ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے جس میں ان دونوں زبانوں پر عبور ضروری ہے۔ کسی زبان کا افسانہ، کہانی اور معاشرتی فضا اور زبان و بیان کے لحاظ سے اس معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جس کی زبان میں لکھا گیا ہو۔ اسے کسی دوسری زبان میں پورے رچاؤ کے ساتھ منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے، اس کے لئے بڑی ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ ترجمے کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ دوسری زبان میں اسی تخلیقی و فوری کا حامل ہو کہ ترجمہ نالگے بلکہ محسوس ہو کہ یہ اسی زبان میں لکھا گیا ہے کہ جس میں ترجمہ کیا گیا ہو۔ نسیم بلوچ کی تدریس کا مضمون فارسی ہے جب کہ اردو ادب میں ایم اے کرنے کے علاوہ اردو زبان کے ادیب بھی ہیں۔ ان کی اس ضمن میں بہت سی جہتیں ہیں۔ گویا وہ بحیثیت ترجمہ نگار دونوں زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ زمانہ طالب علمی 1976ء میں وہ مختلف روزناموں کے لئے انگریزی کے مضامین بھی ترجمہ کرتے رہے ہیں۔ فارسی افسانوں کا اردو ترجمہ بھی زمانہ طالب علمی کے دوران شروع کیا۔ گویا وہ ترجمہ نگاری کا ایک طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ نسیم بلوچ کے دس فارسی افسانوں کے تراجم میں سے نو کا تعلق ایرانی معاشرے اور وہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔

References

- ¹ Ārif Azīz Bhopāl, "Urdū main Tarjamay kī Riwāyat aur us kā Fan" Qirtās-e-Adab (2019).
- ² Naseem Balūch, "Dash Akal" in Azād (1978).
- ³ Naseem Balūch, "Abji Khanum" Al-Zubair 3 (1988):48.
- ⁴ Naseem Balūch, "Kubra Dawūd" Unpublished.
- ⁵ Naseem Balūch, "Khudkushī" Al-Zubair 2, (1996):20.
- ⁶ Naseem Balūch, "Eidī", Al-Zubair 4, (1996):30.
- ⁷ Naseem Balūch, "Gadhay kī Dāiry say aik waraq".
- ⁸ Naseem Balūch, "Wafā", Al-Zubair I, (1996):134.
- ⁹ Naseem Balūch, "An Chāha Bosā", Al-Zubair 3, (1996).
- ¹⁰ Naseem Balūch, "Kayā Palat", Al-Zubair 2, (2000):24.